R. No. 2300/57 | Regd. No. L.72..

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت [illegible]

نئی دہلی ۔ ۹
[illegible]

یکم جون ۱۹۶۴ء	ایڈیٹر۔ آل احمد سرور	جلد ۲۳۔ شمارہ ۲۱

آل احمد سرور

"مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے"

آخر وہی ہوا جس کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ جواہر لال نہرو دہرہ دون میں تین دن آرام کرنے کے بعد دہلی واپس آئے۔ رات کو آرام سے سوئے۔ صبح معمول کے مطابق اُٹھے۔ چھ بج کر بیس منٹ پر اُنھوں نے کچھ تکلیف محسوس کی اور بے ہوش ہو گئے۔ دو بجے اُن کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا۔

صرف اُن کی زندگی کا چراغ گل نہیں ہوا، ہندوستان میں اندھیرا ہو گیا۔ ایشیا کی روشنی جاتی رہی۔ دُنیا پر غم کے بادل چھا گئے۔ ہندوستان کا یہ محبوب رہنما صرف ہندوستان کا رہنما نہیں تھا۔ وہ ساری دنیا کا رہنما تھا۔ اُس نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں صرف ہندوستان کو آزاد نہیں کرایا، کتنے ہی غلام ملکوں میں آزادی کی ایسی تڑپ پیدا کی کہ ان کی زنجیریں ایک جھٹکے کے ساتھ ٹوٹ گئیں۔ اُس نے ہندوستان کی آزادی کی لڑائی اس طرح کامیابی سے لڑی کہ دوست دشمن سب کے سر احترام میں جھک گئے۔ اُس نے سیاست کو اخلاق سکھایا، اُس نے اندھیری راتوں میں اُفق پر روشنی کی ننھی کرن سے لو لگانا سکھایا۔ اس نے زندگی کے آداب سکھائے، اُس نے موت کے آداب سکھائے وہ ہندستانی تھا، وہ مشرقی تھا، وہ مغربی تھا، وہ عالمی ذہن رکھتا تھا۔ اُس میں متضاد عناصر اس طرح جمع ہو گئے تھے کہ اس صدی میں ہندستان کی ایک مثالی تصویر نظر آ گئی تھی۔

وہ ہندوستان کی ننگی بھوکی جنتا کے دل کی ہر دھڑکن کو محسوس کر سکتا تھا۔ وہ عوام کے چہروں سے اُنکے جذبات پڑھ سکتا تھا۔ عوام ہی سے اُسے طاقت اور گرمی ملتی تھی۔ وہ اُن کا عاشق تھا اور عوام اس کے عاشق تھے۔

اس عظیم الشان ملک میں، جہاں پینتالیس کروڑ انسان بستے ہیں۔ جہاں ہر طرح کی آب ہوا، ہر طرح کا طرزِ زندگی، ایک درجن سے اوپر قومی زبانیں اور سیکڑوں چھوٹی چھوٹی بولیاں ہیں جس کی بڑی شاندار تاریخ ہے اور جس نے انسانیت کے غیر فانی کارناموں کے ساتھ بربریت کے افسوسناک مظاہرے بھی دیکھے ہیں، مگر ایک شاندار مستقبل جس کا انتظار کر رہا ہے، ایک جواہر لال ایسا تھا جو سب کی زبان سمجھتا تھا، سب کے درد سے آشنا تھا۔ جس کے یہاں مذہب، زبان، علاقے، عقیدے کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا تھا جسے ہندوستان کی پوری تاریخ سے محبت تھی، جو اس کے جلوۂ صد رنگ کی ہر کرن کو عزیز رکھتا تھا، جو سب کا تھا اور سب کے لئے تھا۔ ہندوستان میں بڑے بڑے فاتح، مدبر، عالم، دانشور، بزرگ، ادیب، شاعر، مفکر گزرے ہیں، مگر ایسا جامع حیثیات آدمی ہماری سرزمین سے کوئی نہیں اُٹھا جو بیک وقت خوابوں کا پجاری، حقایق کا رمز شناس، جنگ آزادی کا سورما اور آزادی کے بعد قوم کا معمار اعظم، ادیب، مورخ، دانشور،

اس اشاعت میں

دُبر، عمل کا مرد میدان، حالات کے پیچ و خم کو سلجھانے والا اور مستقبل کے ہر سربستہ راز کا محرم ہو۔

ہم ہندوستانی کنوئیں کے مینڈک کی سی زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں۔ جواہر لال نے ہمیں عالمی افکار و اقدار کا محرم بنایا۔ دور دراز ملکوں میں آگ لگی تو انہوں نے اس کی چنگاریاں اپنے دل میں محسوس کیں اور ہمیں بھی دوسروں کے درد سے آشنا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم ہی اس گراں بہا متاع کے لُٹ جانے پر ماتم نہیں کر رہے ہیں، ساری دنیا اپنے ایک رہنما کا ماتم کر رہی ہے۔

یوں تو جواہر لال نہرو نے ہندوستان کو اتنا کچھ دیا ہے کہ اُس کی تفصیل ایک دفتر چاہتی ہے، مگر اُن کا سب سے بڑا عطیہ یہ ہے کہ اُنہوں نے بامعنی اور بامقصد زندگی کا مفہوم سمجھایا۔ ساڑھے چوہتر سال کی زندگی یوں کم نہیں ہے مگر اس زندگی میں جواہر لال نے کیا کچھ نہیں کیا۔ تلاش ہند میں ۱۹۴۴ء میں اُنہوں نے لینن کا یہ قول نقل کیا تھا:۔

''انسان کی سب سے عزیز متاع زندگی ہے، اور چونکہ اُس کے مقدر میں ایک ہی دفعہ جینا ہے، اس لئے اسے اس طرح زندگی بسر کرنا چاہیے کہ مرتے وقت وہ کہہ سکے، میری ساری زندگی اور ساری قوت دنیا کے سب سے بڑے مقصد کے لئے وقف تھی یعنی بنی نوع انسان کو غلامی سے نجات دلانا۔' انسانیت کی تاریخ میں اس مقصد کی خاطر اپنی زندگی کو وقف کر دینے کی اور سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے، سفر میں یا حضر میں، خوشی میں یا غم میں اس مقصد کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دینے کی مثالیں اور بھی ملیں گی، مگر ہمارے مُلک میں کم ہیں۔ اس صدی میں تو گاندھی جی کے علاوہ ہندوستان میں کوئی ایسا نام ذہن میں نہیں آتا جو جواہر لال نہرو کی طرح اپنی زندگی کو ایک اعلیٰ مقصد اور مشن کے لئے وقف کرنے کا ہو۔

پھر جواہر لال نہرو نے آزادی کو معنی و مقصد عطا کیا۔ آزادی سے پہلے جب بہت سے لوگ صرف بدیسی سامراج سے نجات پانے کی جد و جہد میں لگے ہوئے تھے اور آزادی کے بعد کا نقشہ اُن کے ذہن میں نہ تھا اور نہ اسکو وہ ضروری سمجھتے تھے، جواہر لال نہرو نے منصوبہ بندی کا ایک کمیشن بنایا اور مستقبل کا ایک ڈھانچہ تیار کیا۔ آج ہماری جمہوریت کا جو قصر بلند ہے اُسکی ہر اینٹ جواہر لال کی رکھی ہوئی ہے۔ جمہوریت، غیر مذہبی ریاست اور سوشلزم کے تصور کو جواہر لال نے نہ صرف زبان سے منوایا بلکہ دلوں میں بٹھایا۔ اُنہیں کی مسلسل تعلیم کے طفیل آج ہمیں یقین ہے کہ جمہوریت اور غیر مذہبی ریاست کے تصور کو ہندوستان کبھی نہیں چھوڑے گا اور اپنے طور پر سوشلزم کی منزل کی طرف برابر بڑھتا رہے گا۔

جواہر لال نہرو نے دنیا کے سیاسی معاملات میں طرفداری کے بجائے سخن فہمی سکھائی۔ اُنہوں نے سب کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا لیکن وہ کبھی بڑی سے بڑی طاقت سے مرعوب نہ ہوئے۔ اُنہوں نے ہمیشہ قوم کو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی تلقین کی۔ اُنہوں نے دوسروں سے بھیک مانگنے کے بجائے خود کفالتی ہونے پر زور دیا۔ ہاں انہوں نے ایسی دوستانہ امداد بڑی خوشی سے قبول کی جس کے پردے میں کوئی سنہری زنجیر نہ تھی صرف اچھے کام میں تعاون کا جذبہ تھا۔ اور ہندوستان کا یہ محبوب رہنما اور دُنیا کا چوٹی کا مُدبر

قرارداد

انجمن ترقی اُردو (ہند) کے کارکنوں کا یہ جلسہ اپنے محبوب رہنما پنڈت جواہر لال نہرو کی وفات پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور اس سانحے کو ہندوستان کے لئے ہی نہیں بلکہ ایشیا اور تمام دُنیا کے لئے ایک بہت بڑا المیہ سمجھتا ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو صرف ہندوستان کے وزیر اعظم ہی نہیں تھے وہ ہندوستان کی سب سے محبوب شخصیت بھی تھے۔ انہوں نے نہ صرف گاندھی جی کی قیادت میں ہندوستان کو آزاد کرایا بلکہ آزادی کے بعد ہماری نئی جمہوریت کی تعمیر کی اور اسے استحکام بخشا۔ انہوں نے غیر مذہبی ریاست کے تصور کو دلوں میں راسخ کیا اور سوشلزم کی منزل کی طرف ہماری رہنمائی کی۔ انہوں نے ہندوستان کو عالمی مسائل کا احساس دلایا اور دنیا میں امن اور انسانیت کا پرچار کر کے ہندوستان کو اقوام عالم میں سربلند کیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی ہمہ گیر شخصیت، ان کی پچاس سال تک ہندوستان اور انسانیت کی خدمت، انکی بے مثل ادبی اور علمی خدمات، انکی نظر کی بلندی، دل کی وسعت، اخلاق کی پاکیزگی اور انکی مظلوم اور ستم رسیدہ انسانیت سے گہری ہمدردی انہیں انسانیت کے محسنوں اور قائدوں کی صف میں کھڑا کر دیتی ہے۔ ہندوستان کی ساری تاریخ سے انکی محبت، مشترک تہذیب سے ان کا عشق، یک جہتی اور اتفاق و اتحاد کیلئے انکی پیہم کوشش، تمام قومی زبانوں کی ترقی کیلئے انکی مساعی، اُردو کے ساتھ انصاف کیلئے انکی مسلسل کاوش ہمیں ہمیشہ انکی یاد دلائینگی۔

اس موقع پر ہم عہد کرتے ہیں کہ ہم جواہر لال نہرو کے پیام کو ہر وقت اپنے سامنے رکھیں گے اور جن اعلیٰ اصولوں کے لئے وہ ساری عمر جد و جہد کرتے رہے، ان سے گرمی اور روشنی لے کر ان کے کام کو آگے بڑھائیں گے اور مکمل کریں گے۔

یہ جلسہ مسز اندرا گاندھی اور ان کے دوسرے عزیزوں سے اپنی گہری ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور ملک، قوم اور انسانیت کے اس سوگ میں شریک ہے۔

اور لیڈر کیسی دلآویز شخصیت رکھتا تھا۔ اس میں کیسی شان محبوبی تھی۔ اُس کا وہ مجسم جو گرد و پیش کی ہر کثافت اور دلوں کے ہر غبار کو دور کر سکتا تھا جس سے پتھر بھی پگھل جاتے تھے جس میں چاندنی کی سی لطافت اور دلآسائی تھی اور نسیم سحری کی سی تازگی اور رحمت و رافت۔ اُس کی بچوں سے گہری دلچسپی، جس کے پیچھے انسانیت کی معصومیت اور اُس کے مستقبل کے امکانات سے لگن پوشیدہ تھی۔ اُس کی حُسن اور حُسن کاری کے ہر جلوے اور ہر ادا سے محبت، بڑے سے بڑے بیرونی مہمان کی موجودگی میں بھی ادبی مجلسوں میں شرکت کے لئے وقت نکالنا، پالم سے سیدھے ساہتیہ اکاڈمی کے جلسے کے لئے دوڑنا، سیاست کے پیچ و خم سلجھاتے ہوئے، کسی ادیب کی مدد، کسی شاعر کی ہمت افزائی، کسی مصور کی سرپرستی، کسی فن کار کی دیکھ بھال کے لئے وقت نکالنا، سب کے دُکھ درد میں شریک ہونا، سب کا دل رکھنے کی کوشش کرنا، غریب طالب علموں کی مدد کرنا اور ان کی زندگی سنوارنا، اُن پُرانے ساتھیوں کے بال بچوں تک کی سرپرستی کرنا جن سے سیاسی اختلاف تھا، ہر ظلم اور زیادتی کے خلاف سینہ سپر ہونا، ہر تعصب اور تنگ نظری کا مقابلہ کرنا، خطروں سے کھیلنا، فسادیوں کے مشتعل ہجوم میں کود پڑنا اور اُن کی خبر لینا۔ اس کی کس کس بات کو یاد کیا جائے ہر کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ بہتری جگہ یہیں ہے۔

میرے ذہن میں جواہرلال نہرو کی ایک نہیں بہت سی تصویریں اُبھرتی ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں جے پور کی پی۔ ای۔ این کانفرنس میں اُن سے ملاقات اور ان کی تقریر، ۱۹۴۷ء کے فسادات کے زمانے میں اُن کا وہ درد میں ڈوبا ہوا مگر ایک عزم لئے ہوئے چہرہ، گاندھی جی کی شہادت پر اُن کی حزیں آواز کہ "ہماری روشنی چلی گئی، آج ہر طرف اندھیرا ہے" مولانا آزاد میموریل لیکچر دیتے ہوئے ہندوستان کے مسائل پر بصیرت افروز تقریر، ساہتیہ اکاڈمی کے جلسوں میں ادبی مسائل پر اظہار خیال، اُردو کانفرنس دہلی میں آزادی کے بعد اُردو کتابوں کی نمائش دیکھ کر اُن کا تبصرہ، چینی حملے کے وقت گمبھیر آواز میں ہندوستانیوں کو متحد ہو کر دشمن کا مقابلہ کرنے کی دعوت، گذشتہ سال انجمن ترقی اُردو ہند کے ایک وفد سے اُن کی ملاقات، جس میں انہوں نے اپنے کمرے کے دروازے پر وفد کا استقبال کیا اور ہر ممبر کا نہایت محبت سے خیر مقدم کیا، گذشتہ دسمبر میں لال قلعے میں بہادر شاہ ظفر کی صد سالہ برسی کے جشن میں اُن کی شرکت۔ ہر تصویر اُن کی رنگا رنگ شخصیت کے کسی دلآویز نقش کو ظاہر کرتی ہے۔ ہر تصویر میں اچھے اور بڑے تصورات سے محبت، زندگی کی بہترین قدروں کی ترجمانی، تہذیب اور انسانیت پر نہ مٹنے والا عزم نرمی، دل سوزی، دل داری کے لازوال نقش ہیں۔

کیا جواہرلال نہرو واقعی مر گئے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ اُن کا جسم خاکی ضرور شعلوں کی نذر ہو گیا۔ وہ جسمانی طور پر ہمارے درمیان نہیں ہیں، مگر کشمیر سے کاویری تک اور آسام سے کاٹھیاواڑ تک اس سرزمین کے چپے چپے پر اُن کے قدموں کے نشان ہیں۔ اس کی فضا میں اُن کی آواز گونج رہی ہے۔ اس کے چوالیس کروڑ باسیوں کے خوابوں میں اُن کی دی ہوئی کرنیں ہیں۔ وہ جس راہ پر چل رہے ہیں وہ اُن کی نکالی ہوئی اور ہموار کی ہوئی ہے۔ تقریباً پچاس برس تک ہندوستان کی زندگی کے ہر موڑ میں وہ شریک رہے۔ آج ہم جو کچھ ہیں اُنھیں کی وجہ سے ہیں۔ وہ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ ہندوستان کو اور اونچا لے جانے کے اُن کے خواب زندہ رہیں گے۔ جمہوریت اور غیر مذہبی ریاست کے استحکام کے لئے ہماری ہر کوشش ہمیں اُن کی یاد دلائے گی اور مشکلات میں ڈھارس دے گی۔ سوشلزم کی طرف ہر قدم میں اُن کی للکار ہم سنتے رہیں گے۔ مشترک تہذیب کے ہر رنگ سے وفاداری کے لئے ہمیں ہر وقت اُن کی مثال کو سامنے رکھنا ہوگا، ہر قومی زبان کو پھلنے پھولنے کا موقع دینے کے لئے ہمیں اُن کے ہر مشورے پر عمل کرنا ہوگا۔ ماضی کی شاندار اور صالح روایات کو اپناتے ہوئے نئے صنعتی دور کی بساط میں اپنی جگہ محفوظ کرنے کیلئے ہمیں جواہرلال کے بنائے ہوئے خطوط کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ یک جہتی اور اتحاد و اتفاق کے ترانے گانے کے لئے اُن کے الفاظ سے گرمی لینی ہوگی، بیرونی خطروں سے ملک کو محفوظ رکھنے کے لئے، ملک کو طاقتور بنانے کے مشن میں اُن کا عزم اُن کا حوصلہ یاد آئے گا۔ رزم ہو یا بزم دونوں میں پاک دلی و پاک بازی کے لئے بھی اُن کی مثال سامنے رکھنی پڑے گی۔

جواہرلال نہرو نے ہندوستان کو اتنا کچھ دیا ہے کہ رہتی دنیا تک اُن کا کام اور نام زندہ رہے گا۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اب تک جب بھی ملک پر وقت پڑا انہوں نے ہماری رہنمائی کی اور ہر مشکل کا مقابلہ کیا۔ اب ہمارا فرض ہے کہ اُن کے تصور حیات، اُن کے سماجی اقدار، اُن کے اخلاقی حربے، اُن کی جامعیت، اُن کی ان تھک خدمت اور گرم و گداز طبیعت کو اپنا رہنما بنائیں۔ اُن کی طرح اپنی زندگی کے ہر لمحے کو ملک و قوم اور انسانیت کی خدمت کے لئے وقف کر دیں جمہوریت اور غیر مذہبی ریاست کی تعمیر کو ایسا مستحکم کر دیں کہ کوئی آندھی اُسے زیر و زبر نہ کر سکے۔ سوشلزم کی منزل کی طرف تیزی سے بڑھیں اور ملک کی یک جہتی کو ہر حال میں قائم رکھیں۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ جواہرلال کے لئے ہمارا سوگ جذباتی اور رسمی ہو کر رہ جائے۔ اُن کی جُدائی پر رنج قدرتی ہے

اس غم میں آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا جاری نہ ہو تو تعجب ہے مگر ہمیں آنسو پونچھ کر جواہر لال کے مشن کی تکمیل میں لگ جانا ہے کیونکہ یہی جواہر لال کے ساتھ ہماری محبت کا حقیقی ثبوت اور یہی ان کی گراں قدر خدمات کا صحیح اعتراف ہوگا۔

جواہر لال نہرو سے ہمیں جے ہند کہنا سکھایا تھا۔ اس لئے جے ہند پر ہی ہم اس اُکھڑی اُکھڑی اور بے ربط تحریر کو ختم کرتے ہیں۔ یہ اتنا بڑا سانحہ ہے کہ ابھی اپنے حواس مجتمع کرنا کم از کم میرے بس میں تو کیا، اُن سب لوگوں کے بس میں نہیں، جن کے لئے اُن کا وجود زندگی کے ہر موڑ پر ایک مشعل کا سا تھا، جن کے لئے جواہر لال کی پُرسوز شخصیت تسکین اور تقویت کا باعث تھی اور جو ان سے اس طرح محبت کرتے تھے کہ ہر رشتہ اس رشتے کے سامنے ہیچ تھا۔ جواہر لال نہرو زندہ باد۔ جے ہند

مجنوں گورکھپوری

پنڈت جواہر لال نہرو

ایک ذاتی تاثر

(ایک نوجوان دوست کے نام اپنے ایک خط سے اقتباس)

۲۷ مئی ۱۹۶۴ء — ۸ بجے رات

"...... آج دن میں بہت تھک کر کمرہ بند کر کے لیٹ گیا تھا۔ چار بجے دروازہ کھول کر نکلا تو پہلی خبر جو سُنی وہ جواہر لال جی کی موت تھی۔ چکرا کر رہ گیا۔ ملک کی بڑی نازک ساعت میں موت نے ان کو ہم سے چھین لیا۔ ۱۹۳۳ء کے بعد مجھے جواہر لال جی سے ملنے کا اتفاق نہ ہو سکا۔ اس سے پہلے خاص کر ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۶ء تک اکثر قرب حاصل رہا۔ مجھے ۱۹۲۵ء کا زمانہ اس وقت بڑی کسک کے ساتھ یاد آ رہا ہے۔ ۱۰۷۔ ہیویٹ روڈ الہ آباد کے ایک فلیٹ کی تیسری منزل پر میں اور رگھوپتی سہائے (فراق) رہتے تھے اور کئی دوسرے کانگریسی دوست بھی بغل کے کمروں میں تھے۔ نیچے دوسری منزل پر کانگریس کمیٹی کا دفتر تھا جواہر لال جی اس کے جنرل سکریٹری تھے۔ دن میں کئی بار ملاقات ہوتی تھی۔ وہ اور رفیع احمد قدوائی مرحوم کبھی کبھی چائے پینے ہمارے کمرے میں آ جاتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب الہ آباد کا انگریز کلکٹر کا کوری ڈکیتی کے بہانے شریف سے شریف کانگریسیوں کو شبہ میں ماخوذ کر کے ان پر مقدمہ چلاتا تھا اور چار ماہ تک جیل میں بند رکھ کر ان کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتا تھا۔ پنڈت موتی لال مرحوم، جواہر لال جی اور الہ آباد کے دوسرے اکابر نے اس بلا کو دور کرنے میں کیسی کیسی مشقتیں اُٹھائیں؟ اس کا اندازہ آج کے آزاد ہندوستان میں نئی نسل مشکل ہی سے کر سکتی ہے۔ اسی زمانے میں انگریز کی فرقہ وارانہ حکمت عملی نے الہ آباد میں رام لیلا کے موقع پر ہندو مسلم فساد کا اندرونی طور پر پورا سامان کر رکھا تھا۔ فساد نہیں ہونے پایا۔ الہ آباد کے نیک نیت سربرآوردہ لوگوں نے جاں فشانی کے ساتھ اس کے روک دینے کی کوششیں کیں ان کوششوں میں جواہر لال جی صدق دل سے پیش پیش تھے۔ اسی وقت سے میں ان کا گرویدہ ہو گیا۔ وہ واقعی فرقہ وارانہ ذہنیت کے دشمن تھے۔ وہ ایک مہذب انسان تھے اور مہذب انسانیت کے قائل تھے۔ وہ دہریہ یا ملحد یا خدا سے منکر ہوئے بغیر صحیح معنوں میں غیر دینی (Secular) مزاج لے کر پیدا ہوئے تھے۔ ان کے اس غیر دینی مزاج کی ہر قیمت پر لاج رکھنا ہمارا اولین فرض ہے۔

وہ فطری طور پر پیش قدم (Progressive) تھے اور نہ صرف اپنے ملک بلکہ ساری انسانی دنیا کی آزادی اور ترقی چاہتے تھے۔ ہندوستان کو صحیح راستہ پر لگانے اور صلح و امن کے ساتھ آزاد اور آگے بڑھانے کے لئے انھوں نے جتنا کچھ کیا وہ ان کے اپنے مزاج و کردار کا تقاضا تھا، اور جو کچھ وہ کرنا چاہتے تھے اور نہ کر سکے اسکے ذمہ دار وہ عائلات و مزاحم تھے جو ہر ملک میں ترقی کے راستے میں خلل انداز ہوتے آئے ہیں اور جن کی ہمارے ملک میں بھی افراط ہے۔ میں نے جواہر لال جی کو ہمیشہ اپنی تخیل کے مطابق ایک شریف ہندوستانی اور ایک صاف ستھرے ہندوستان کا حامی سمجھا... وہ ہندوستان کے جسم کی صحت، اس کے دل و دماغ کی روز افزوں قوت، اس کے نفس کی شرافت یعنی بحیثیت کل ہندوستان کی مائل بہ ارتقا سالمیت کی ضمانت تھے۔ دیکھو اب کیا ہوتا ہے اور ہمارا ملک کدھر جاتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک پورا باب آج ختم ہو گیا۔ اس کے بعد نیا باب کیسا ہوگا؟ خدا کرے بہتر ہو۔ مگر جواہر لال جیسے لوگ روز نہیں پیدا ہوتے۔ وہ صرف ایک ذات نہیں تھے۔ وہ ایک علامت تھے، ملک کے ترقی پذیر رجحان اور خوب سے خوب تر مستقبل کی ایک حوصلہ انگیز اور امید افزا علامت۔ وہ آج کی ساری دنیا میں ہندوستان کی آبرو تھے۔ پورے تیس سال سے میں نے ان کو نہیں دیکھا۔ ان سے میری آخری ملاقات ۱۹۳۴ء میں آنند بھون میں ہوئی جبکہ وہ حال ہی جیل سے نکلے تھے اور بہار کے زلزلے کے سلسلے میں ریلیف کے لئے دوڑ دھوپ کر رہے تھے مسز کملا نہرو آنجہانی نے جس تپاک سے ہم لوگوں کو چائے پلائی تھی اس کی لذت کو میں کبھی نہیں بھولا۔ خاموش طور پر میں جواہر لال جی سے ذہنی میل اور روحانی قرب آج بھی اتنا ہی محسوس کر رہا تھا جتنا اب سے چالیس سال پہلے محسوس کرتا تھا۔ زندگی کا ایک پورا دور ختم ہو چکا۔ اب تم لوگوں کا زمانہ ہے۔ خدا تم لوگوں یعنی نوجوانوں کو سلامت رکھے، اور توفیق دے کہ وہ ہم سے بہتر کچھ کر کے دکھا سکیں ...."

غزلیں

خرد غوث پوری

اے ساقی گلفام یہ دیوانے ہیں کس کے
میخانے جو تیرے ہیں تو مستانے ہیں کس کے
آنکھوں کی کسی شکل سے سیری نہیں ہوتی
بکھرے ہوئے یہ جلوے خدا جانے ہیں کس کے
یہ راز سمجھنے کا ہے اس راز کو سمجھو
اپنے اگر اپنے ہیں تو بیگانے ہیں کس کے
جو تجھ پہ فدا ہونے کو تیار ہیں ہر دم
اے شمع بتا مجھ کو یہ پروانے ہیں کس کے
صد حشر بکف شور ہے فریاد و فغاں کا
آغوش میں شعلوں کے یہ کاشانے ہیں کس کے
محلوں میں جو رہتے ہیں وہ کہلائیں تمہارے
صحرا میں جو بستے ہیں وہ دیوانے ہیں کس کے
سننے کے لئے ان کو امڈ آئی ہے دنیا
رقصاں مرے ہونٹوں پہ یہ افسانے ہیں کس کے
گلشن بھی تمہارے ہیں بہاریں بھی تمہاری
لیکن یہ خزاں اور یہ ویرانے ہیں کس کے
یہ بھی تو ہیں کچھ مستحق لطف و عنایت
فرزانے تمہارے ہیں تو دیوانے ہیں کس کے
ساقی کا خرد کہنا ہے "رندوں کے نہیں ہیں"
پھر جام یہ کس کے ہیں یہ پیمانے ہیں کس کے

اسما سعیدی

چمن میں رہ کے بھی رنجور ہوں میں
بہار ہے خزاں سے دور ہوں میں
سرِ منزل پہنچ کر بھی تو جیسے
ابھی منزل سے کوسوں دور ہوں میں
ستم بھی آپ کا مجھ پہ کرم ہے
بہت ممنون ہوں مشکور ہوں میں
مبارک ہو غرورِ حسن ان کو
نیازِ عشق پر مغرور ہوں میں
ذرا غم کی گوارائی تو دیکھو
کوئی سمجھے بہت مسرور ہوں میں
بہاریں ہو گئی ہیں مجھ پہ دوبھر
دلِ افسردہ سے مجبور ہوں میں
کہاں میں اور قربِ حسن اسما
ابھی تو عشق سے بھی دور ہوں میں

کتابوں کی برآمد

یہ بات یقیناً حیرت انگیز ہے کہ انگلستان میں کتابوں کی تجارت گذشتہ سال ۹ کروڑ پونڈ تک پہنچ گئی۔ زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ ۳۴ فی صدی کتابیں دوسرے ممالک کو برآمد کی گئیں جس سے ۳ کروڑ ۹۰ لاکھ روپیہ کا زر مبادلہ حاصل ہوا۔ ہندوستان کے لئے یہ بات دلچسپ ثابت ہو سکتی ہے کہ برآمد ہونے والی اشیاء میں کتابوں کو بھی خاص مقام حاصل ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک میں کتابوں کی صنعت ابھی اپنے بچپن ہی میں ہے جس کی وجہ یہاں کے عوام کی ایک بڑی تعداد کی ناخواندگی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہاں کتابوں کی فروخت کے لئے میدان وسیع نہیں اور اسی لئے یہاں کتابوں کی قیمتیں بیرونی ممالک کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتی ہیں پھر یہ کہ انگریزی خواں لوگوں کی تعداد برطانیہ اور امریکہ کے مقابلے میں یہاں صفر کے برابر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں شائع ہونے والی کتابوں کے لئے کبھی بھی بین الاقوامی بازار نہیں تلاش کئے گئے۔ یہاں کے اشاعتی اداروں کے پاس بیرونی ممالک میں اپنی کتابوں کی مناسب نمائش کے وسائل بھی موجود نہیں ہیں۔ ہاں! حکومت ہند کا شعبۂ نشر و اشاعت اپنی کتابوں کی خاطر خواہ نمائش سفارتی نمائندوں کے ذریعے کر سکتا ہے۔ بیرونی ممالک میں ہمارے سفارت خانے ان کتابوں کو بڑی بڑی دکانوں پر نمائش کے لئے رکھ سکتے ہیں اور ان کو عوام میں تقسیم کر کے ان کے دلوں میں یہاں کی کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا کر سکتے ہیں۔ اس لئے حکومت کو فوری طور پر اس طرف توجہ دینی چاہئے۔ بہت ممکن ہے اس طرح سے ہم بھی آگے چل کر کتابیں برآمد کرنے والے ممالک کی فہرست میں آ جائیں۔ (انڈین اکسپریس)

طبی اصطلاحوں سے متعلق سیمینار

پہلی سے ۲۷ جون تک بنگلور میں طبی اصطلاحوں کے متعلق ایک سیمینار منعقد ہو گا۔ اس میں مختلف ریاستوں اور لسانی علاقوں کے نمائندے شرکت کریں گے اور اس کا اہتمام سائنسی اور تکنیکی اصطلاحات کا کمیشن کرے گا۔

مذکورہ کمیشن سائنس اور ٹیکنالوجی کے مختلف شعبوں کی اصطلاحیں ہندوستانی زبانوں میں وضع کرنے کا کام کر رہا ہے۔ اس وقت کمیشن ہندوستانی زبانوں میں بھی اصطلاحات ڈھالنے میں مصروف ہے۔
(قومی آواز)

ایم۔ اے۔ حسن بھنسرڈی

اُردو قواعد

املا کی بحث کے سلسلے میں میں نے مروّجہ اُردو پرائمر اور قواعد کو موضوعِ بحث بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے کبھی کہا تھا کہ میرا موضوعِ بحث اُردو ادب یا شعر و شاعری نہیں ہے بلکہ صرف درسی طور پر اُردو کو سہل سے سہل تر بنانا ہے تاکہ کم سے کم وقت اور محنت میں اُردو سیکھی جا سکے اور کم پڑھے لکھے بھی عام فہم ہی سہی لیکن صحیح عبارتوں میں اظہارِ خیال کرنا جان جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے ایک قابلِ فہم پرائمر اور سائنٹفک قواعد کی ضرورت ہوگی۔ جہاں تک سہل الحصول پرائمر تیار کرنے کا سوال ہے جب تک املا کمیٹی کی رپورٹ شائع نہ ہو جائے متوقع اصلاحوں کے تحت پرائمر لکھنا ناممکن ہے۔ اس لئے میرے خیال میں اس بحث کو سرِدست ملتوی کر کے مروّجہ اُردو قواعد پر غور کر لینا اپنے وقت کا صحیح مصرف ہوگا۔

اکثر حضرات کہتے ہیں کہ عربی، فارسی اور سنسکرت جیسی کلاسیکل زبانیں ہی قواعد کی پابند ہوتی ہیں لیکن اُردو جیسی جدید زبانیں قواعد کی محتاج نہیں ہوتیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اُردو زبان گویا ایک بے لگام گھوڑا ہے جس کو جو جی چاہے لکھ پڑھ دے۔ کیونکہ عبارتوں کو صحیح یا غلط قرار دینے کے لئے کوئی قاعدہ کلیہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہ دعویٰ ٹھیک ہے تو پھر میں کہوں گا کہ "سلیم نے گھر گیا۔ آم نے کھایا بسلہ نے بھات کھائی۔ عمر روٹی کھایا۔ اور میں کو گھر جانا ہے" صحیح عبارتیں ہیں۔ اگر آپ کو اعتراض ہے تو یقیناً میں آپ سے دلیل طلب کروں گا اور آپ اپنی تائید میں جو دلائل پیش کریں گے وہی "اُردو قواعد" ہوں گی۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اُردو زبان اس حد تک قواعد کی پابند نہیں ہے جس حد تک کلاسیکل زبانیں ہوتی ہیں مگر میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ اُردو زبان کو قواعد سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔ اُردو اب خاصی پرانی زبان ہو گئی ہے۔ عبارتوں میں الفاظ کی ترتیب، علاماتِ (حروفِ) تخصیص و تعدی (کو، نے، سے، پر) کا استعمال، فاعل اور فعل کی مطابقت اور تذکیر و تانیث کا ایک خاص رواج یا قاعدہ مقرر ہو گیا ہے۔ تو بھی سوال یہی فیصلہ کرتا ہے کہ اُردو زبان میں قواعد کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو پھر قواعد کا ذکر ہی نہ کیا جائے اور اگر ہے تو پھر اس کی سائنٹفک ترتیب ہونی چاہئے۔

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ مروّجہ اُردو قواعد پڑھنے سے طلبہ قواعد پڑھنے کا فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ میں خود بھی طالب العلمی کے زمانے میں اُردو قواعد کو ایک دردِ سری سمجھتا رہا اور جبراً و قہراً پڑھا بھی تو محض امتحان پاس کرنے کے لئے۔ مجھے ثانوی منزل تک کے امتحانی پرچوں کو دیکھنے کا ایک مدت تک اتفاق ہوا ہے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بارہ سال تک اُردو پڑھنے کے بعد بھی زیادہ تر طلبہ میں صحیح عبارتوں میں تحریری اظہارِ خیال کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ اور اس کا واحد سبب موجودہ اُردو قواعد کی بے ترتیبی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہوئی عدمِ توجہی ہی ہے۔ اُردو قواعد میں زیادہ تر فارسی اور عربی قواعد کی تقلید کی گئی ہے۔ حالانکہ لسانیات کے اعتبار سے یہ دونوں اُردو سے مختلف زبانیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو قواعد کی اکثر اصطلاحوں کی تقسیم و تعریف بالکل مبہم اور غیر واضح ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ ابتدائی درجوں میں بچّوں کو قواعد کی پیچیدگیوں میں اُلجھانا نقصان دہ ہوتا ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ انتہائی درجوں میں اُردو ادب کا ایک زمانے تک مطالعہ کر لینے کے بعد طلبہ قواعد کے محتاج نہیں ہوتے مگر درمیانی (۴ سے ۱۱) درجوں کے طلبہ کے لئے قواعد ایک ضروری مضمون رہنا چاہئے تاکہ وہ عبارتوں کو قواعد کی کسوٹی پر پرکھ سکیں۔

آیئے! مروّجہ اُردو قواعد کے صرف ان پہلوؤں پر سرسری نظر ڈالیں جو میرے خیال میں غلط فہمی پیدا کرتے ہیں۔ سب سے پہلے قواعد کی پہلی تقسیم پر غور کیجئے۔ اُردو قواعد کو علم حرف، علم صرف اور علم نحو تین قسموں میں بانٹا گیا ہے۔ ہندی اور انگریزی قواعد کے اعتبار سے علم اوقاف (चिनम वि. Punctuation) اور علم عروض (छन्द बिचार Prosody) بھی اس تقسیم میں شامل ہیں۔ آخر اس تقسیم میں اختلاف کیوں ہے؟ کیا اوقاف اور عروض اُردو ادب میں شامل نہیں ہیں؟ کیا ہم اپنی تحریر میں اوقاف کا خیال نہیں کرتے؟ اور کیا ہم اشعار میں اظہارِ خیال نہیں کرتے؟ اگر کرتے ہیں تو قواعد کی اس تقسیم میں علم اوقاف اور علم عروض بھی شامل کر دینا چاہئے۔ اگر قواعد کی یہ تقسیم تسلیم کر لی جائے تو لازماً ہم اوقاف اور عروض کے قواعد پر عمل کرنے کے لئے پابند ہوں گے۔ خالص اُردو داں طبقہ میں اوقاف کی غلطی عام طور پر پائی جاتی ہے۔ علم عروض کو بھی ایک ہوّا بنا کر قواعد سے الگ کر دیا گیا ہے۔ ورنہ میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر مصرعہ، قافیہ، ردیف اور اوزان وغیرہ کی مبادی باتیں طلبہ کو بتا دی جائیں تو درجہ پنجم کے لڑکے بھی ہم وزن مصرعے بنا کر نظمیں کہہ سکتے ہیں اور جب طلبہ میں اس طرح شاعری کا ذوق پیدا ہو جائے گا تو ذاتی مطالعہ اور مشق کے ذریعے وہ اچھے شاعر بھی بن سکتے ہیں۔ اس موقع پر

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ علم صرف کی تقسیم اور تعریف کے متعلق دنیا کی تمام زبانوں میں بڑی حد تک یکسانیت ہوتی ہے۔ ہاں البتہ علم نحو کے متعلق ہر زبان کا اپنا مخصوص قاعدہ ہوتا ہے لیکن جہاں تک ہندی اُردو قواعد کا تعلق ہے نحو کے متعلق بھی دونوں کے بنیادی اصولوں میں اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔

علم حرف۔ املا کی بحث میں علم حرف پر میں کافی روشنی ڈال چکا ہوں۔ پھر بھی املا کمیٹی کی رپورٹ شائع ہونے کے بعد اُردو پر اَز سر نو بحث کرتے وقت پھر سے اس کا مختصر اعادہ کر دوں گا۔

علم صرف۔ اُردو قواعد کے مطابق کلمہ کی اسم، فعل اور حرف تین قسمیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اُردو زبان کے وہ سارے الفاظ جنھیں ہم لکھتے پڑھتے، کہتے سُنتے یا لغات اور کتابوں میں دیکھتے ہیں اسم، فعل یا حرف ہو سکتے ہیں۔ اوّل تو اس تقسیم میں "حرف" ایک مبہم سا لفظ ہے۔ کیونکہ حرف سے حرف تہجی (ا ب ج د) بھی مراد ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ بھی کہ اس طرح حرف کے شجرے میں انگریزی کے Adverb، Preposition، Conjunction اور Interjection چار اصطلاحوں کو رکھنا پڑتا ہے جس سے بڑی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ اگر حرف کے بدلے "حروف" کہا جاتا تو البتہ دوسری بات تھی۔ سمجھنے والے سمجھ جاتے کہ جب کئی حروف مل کر معنی دار مکمل الفاظ نہیں بناتے تو انھیں محض "حروف" (حرف کی جمع) کہتے ہیں۔ اسی طرح اس تقسیم کے مطابق صفت اور ضمیر کو بھی اسم کے ساتھ رکھنا پڑتا ہے جو غلط ہے۔ صفت کو کسی بھی حالت میں اسم کہنا سراسر غلط ہے۔ صفت اور اسم میں بہت بڑا فرق ہے۔ ضمیر اور اسم میں بھی نمایاں فرق ہے اسی لئے، کیوں نہ کلمہ کی اسم (Noun संज्ञा) ضمیر (Pronoun सर्वनाम) صفت (Adjective विशेषण) فعل (verb क्रिया) تمیز (Adverb क्रियाविशेषण) جار (Preposition सम्बन्ध सूचक) عطف (Conjunction संयोजक बो) اور ندا (Interjection विस्मयादि बो) آٹھ قسمیں مقرر کر دی جائیں۔ اس طرح جہاں ہندی اور انگریزی پڑھنے والوں کے لئے اُردو قواعد سمجھنا آسان ہو جائے گا وہاں اُردو کی یہ تقسیم اور واضح ہو جائے گی اور حرف جیسی کلمہ کی غلط اصطلاح بھی ختم ہو جائے گی۔

اسم کے اقسام۔ اُردو قواعد میں اسم کی تقسیم بھی بے حد پیچیدہ ہے۔ پہلے تو اسم کی اسم معرفہ اور نکرہ سادہ تقسیم کی گئی ہے اور پھر بعد میں اسم معرفہ کی سات (علم، ضمیر، اسم اشارہ، اسم موصول، اسم معہود، منادیٰ اور مضاف) اور اسم نکرہ کی آٹھ (اسم ذات، اسم صفت، اسم مفعول وغیرہ) قسمیں کر کے اس تقسیم کو پیچیدہ اور ناقابل فہم بنا دیا گیا ہے۔ اس تقسیم پر نظر ڈالئے۔ "علم" تو خیر اسم معرفہ ہے ہی لیکن ضمیر، اسم اشارہ، منادیٰ اور مضاف کو اسم معرفہ کے شجرے میں رکھنا مناسب نہیں ہے۔ "کوئی آیا تھا" جملہ میں "کوئی" ضمیر ہے لیکن یہ کسی غیر معین شخص کے بدلے میں آیا ہے۔ اس سے کسی خاص شخص کا تصور ذہن میں نہیں آتا۔ "اسم اشارہ" کوئی اسم نہیں ہوتا۔ "وہ آدمی آیا" جملہ میں "وہ" صفت اشارہ ہے نہ کہ اسم اشارہ۔ اور "وہ کل آیا" جملہ میں "وہ" ضمیر اشارہ ہے، نہ کہ اسم اشارہ۔ "حضرات! خاموش رہیے" جملہ میں "حضرات" منادیٰ ہے لیکن اس سے بھی کوئی خاص شخص مراد نہیں ہوتا۔ "وہاں ہندی کی کتاب ہے" عبارت میں "کتاب" مضاف ہے لیکن یہاں بھی "کتاب" اسم نکرہ ہی ہے۔ اسی طرح اسم نکرہ کی قسموں میں سے اسم ذات کو چھوڑ کر باقی تمام اسم معرفہ اور نکرہ دونوں ہو سکتے ہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس اسم کی یہ تقسیم بھی غلط فہمی پیدا کر سکتی ہے۔ میری تجویز ہے کہ معنی کے اعتبار سے اسم کی مذکورہ بالا تقسیم کے بدلے اسم معرفہ (Proper noun व्यक्ति वाचक) اسم نکرہ (Common noun जाति वाचक) اسم مادہ (Material noun द्रव वाचक) اسم کیفیت (Abstract noun भाव वाचक) اور اسم جمع (Collective noun समूह वाचक) پانچ قسمیں مقرر کی جائیں اور اسماء مصادر اور دوسرے الفاظ میں لواحق لگا کر اسم مفعول، اسم آلہ، اسم معاوضہ، اسم فاعل اور دوسرے الفاظ بنانا بچوں کو بتایا جائے۔ اس موقع پر فارسی اور عربی الفاظ سے بھی مختلف الفاظ بنا کر طلبہ کے ذخیرۂ الفاظ کو بڑھایا جا سکتا ہے۔ میری تجویز ہے کہ جو لواحق مصدر میں لگائے جائیں انھیں (कृत प्रत्यय) لواحق مصدری اور جو مصادر کو چھوڑ کر دوسرے الفاظ میں لگیں انھیں لواحق غیر مصدری (तद्धित प्रत्यय) کہا جائے۔ اس طرح اُردو قواعد کا ہندی قواعد سے ربط پیدا ہو جائے گا۔ مثالیں۔

لکھنا مصدر سے۔ لکھا، لکھتا ہے، لکھنے کا، لکھا ہوگا (افعال)، لکھنے والا (اسم فاعل)، لکھاوٹ (اسم کیفیت)، لکھائی (اسم معاوضہ)، اچھا (صفت) سے اچھائی (اسم کیفیت)، آدمی (اسم) سے آدمیت، وغیرہ ....

مرکب الفاظ کی بناوٹ۔ ہندی میں مرکب الفاظ تین قاعدوں سے بنتے ہیں یعنی (۱) جب دو الفاظ آپس میں اس طرح ملیں کہ ان کے ملنے سے حروف متاثر ہو جائیں تو اس عمل کو

"सन्धि" (اتصال) اور اس سے بنے ہوئے الفاظ کو "सन्धीय" (متصل) کہتے ہیں جیسے حیدر + آباد = حیدرآباد (د غائب) دریا + دار گنج = دریار گنج (الف غائب) مہا + اتسو = مہوتسو (آ کے بدلے و) جگت + ناتھ = جگن ناتھ (ت غائب اور ن پر تشدید) سن + آچار = سماچار (ن کے بدلے م) وغیرہ۔

(۲) جب دو الفاظ اپنے حروف علامت (کا، کو، سے، اور، و وغیرہ) کو چھوڑ کر اس طرح مل جائیں کہ ان کے ملنے سے حروف متاثر نہ ہوں تو اس عمل کو समास (الحاق) اور اس سے بنے ہوئے الفاظ کو समासीय (ملحق) کہتے ہیں جیسے ہندوستان کا وزیر = وزیر ہند۔ جو وزیر اعظم ہو = وزیر اعظم، گل کی جگہ = گلستاں، جس میں پنج شیل ہوں پنج شیل۔ دن اور رات = دن رات وغیرہ۔

(۳) جب ایک ہی لفظ مکرر یا اس کے ساتھ اس کا متضاد لفظ بغیر کسی تغیر کے آپس میں مل جائے تو اس عمل کو पुनर्युक्ति (تکرار) اور اس طرح بنے ہوئے لفظ کو पुनर्युक्तीय (مکرر) کہتے ہیں جیسے گھر + گھر = گھر گھر، در + در = در در، رونا + گانا = رونا گانا، برا + بھلا وغیرہ۔ اگر مذکورہ بالا تینوں قاعدوں پر غور کیا جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اردو، فارسی اور عربی میں بھی مرکب الفاظ بنانے کے یہی طریقے ہیں۔ میری تجویز ہے کہ اوپر بتائی گئی اصطلاحوں کے ساتھ اردو قواعد میں ان اصولوں کو مان لیا جائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو طلبہ ہندی، فارسی، عربی اور سنسکرت وغیرہ کے کسی دو الفاظ سے نئے نئے مرکب الفاظ بنانا سیکھ جائیں گے، مرکب الفاظ کی بناوٹ کا انھیں صحیح علم ہو جائے گا اور ساتھ ہی ساتھ ہندی قواعد کی ان اصطلاحوں کی واقفیت بھی ہو جائے گی۔

اسم کی حالتیں - عام طور پر انگریزی اور اردو قواعد میں اسم کی فاعلی (Nominative) مفعولی (objective) اور اضافی (Possessive) تین حالتیں رائج ہیں۔ لیکن انگریزی قواعد کے مشہور واقف کار (نیسفیلڈ) نے اقرار کیا ہے کہ اسم کی اور بہت سی حالتیں بھی ہیں جو عبارتوں میں استعمال ہوتی ہیں۔ ہندی قواعد میں اسم کی آٹھ حالتیں بتائی گئی ہیں۔ ہندی کی یہ تقسیم اردو اور انگریزی تقسیم سے زیادہ واضح ہے۔ ذیل کی مثالوں پر غور کیجئے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ہر عبارت میں ایک ہی اسم (قلم) کی مختلف حالت ہے۔

(۱) قلم ٹوٹ گیا (حالتِ فاعلی "कर्ता कारक")

(۲) میرا قلم (حالتِ اضافی सम्बन्ध का) (۳) میں نے قلم خریدا (حالتِ مفعولی कर्म कारक) (خریدا فعل کا مفعول)۔ (۴) میں قلم سے کاپی لکھتا ہوں۔ فعل صادر ہونے کا واسطہ، ذریعہ یا آلہ (حالتِ توسلی करण का) (۵) میں نے قلم پر نقش بنایا۔ فعل صادر ہونے کی جگہ (حالتِ ظرفی अधिकरण का) (۶) میں نے قلم سے نب نکالی، اسم سے کسی چیز کے اخراج کی حالت (حالتِ خارجی अपादान का) (۷) میں نے قلم کے لئے نب خریدی۔ فعل کے صادر ہونے کی غرض (حالتِ غرضی सम्प्रदान का) (۸) اے قلم! تو بہت کارآمد ہے۔ پکارنے یا مخاطب کرنے کی حالت (حالتِ منادی संबोधन का)۔ اردو قواعد میں اول الذکر دو حالتوں کو چھوڑ کر باقی تمام کو حالتِ مفعولی ہی کہا گیا ہے۔ حالانکہ انگریزی ہندی یا اردو قواعد کے اعتبار سے بھی موخر الذکر پانچ حالتوں میں "قلم" مفعول نہیں ہے۔ ان عبارتوں میں کاپی نقش اور نب ترتیب وار مفعول ہیں۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ ہم ہندی کی یہ تقسیم تسلیم کر لیتے۔ اس طرح اس معاملے میں جہاں ہندی اردو قواعد میں یکسانیت ہو جاتی وہاں اردو کی تقسیم بھی واضح ہو جاتی اور اگر اردو دوست یہ تقسیم قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں تو پھر انھیں انگریزی کی طرح بقیہ حالتوں کو حروف علامت (سے، پر، کے لئے وغیرہ) کا مفعول (object to the Priposition) ہی کہنا چاہئے۔

علم صرف کے متعلق باقی کسی بھی معاملے میں ہندی اردو قواعد میں اختلاف نہیں ہے اور نہ اب دوسری باتوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ البتہ میری تجویز ہے کہ جن مختصر اسماء (تقریباً ایک ڈیڑھ درجن) کے جنس کے متعلق ہندی اردو میں اختلاف ہے انھیں ہندی کی تقلید سے ختم کر دیا جائے۔ غیر ذی روح اسماء کی جنس محض رواج پر منحصر ہوتی ہے ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ ان میں کوئی جنس ہی نہیں ہوتی۔ جہاں تک وحدیت اور جمعیت کے اصول کا تعلق ہے صرف فارسی اور عربی الفاظ کے لئے ہم عربی اور فارسی قواعد کی تقلید کریں گے اور باقی تمام الفاظ کے لئے آج کی طرح ہندی کا طریقہ ہی اپنا دیں گے۔

آخر میں میں اردو دوستوں سے اپیل کرتا ہوں کہ اس مضمون کا ادبی لحاظ سے نہیں بلکہ فنی اعتبار سے مطالعہ فرمائیں اور اصلاحی جذبے کے تحت اپنے قیمتی مشوروں سے اردو قواعد کی ترتیب میں میرا ہاتھ بٹائیں۔ شکریہ۔

(علم نحو آئندہ یعنی اس بحث کے بعد)

رسالہ "مولوی" کے ایڈیٹر کا انتقال

جناب منشی عبدالحمید صاحب ایڈیٹر رسالہ "مولوی" کا طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ منشی صاحب مرحوم علاج کے لئے اپنے بچوں کے پاس پاکستان گئے ہوئے تھے۔ منشی صاحب دہلی کے پرانے صحافی تھے اور اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جسے خواجہ حسن نظامی کے فیض صحبت نے صحافت کی طرف مائل کیا۔ مرحوم کا رسالہ "مولوی" ایک زمانے میں اردو کا سب سے زیادہ کثیر الاشاعت پرچہ رہ چکا ہے۔ (سیاست جدید)

مراسلات

ادیب اور فسادات

۱۹۶۴ء میں فسادات کی طرف ادیب کے رویئے پر گفتگو کرنے کے لئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں۔ فسادات معاشرے کے انسانی حادثات ہیں۔ ان حادثوں پر مختلف سماجی زاویوں سے روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔ ایک اہم زاویہ ادب کا بھی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ادیب بحیثیت ادیب ایک گوشہ نشین ہوتا ہے اور عملی حرکت میں شرکت اس کے دائرے سے باہر ہے۔ مگر خود معاملے کا سیاسی پہلو جو اصلاً اہل سیاست سے متعلق ہوتے ہیں وہ ہمارے سامنے نہیں، بروقت ہمارے پیش نظر معاملے کا خالص ذہنی پہلو ہے جو بہر حال دوسرے علوم کے ساتھ ادب کی بھی براہ راست ذمے داری ہے۔ اور در اصل یہ ذہنی پہلو ہی سب سے بنیادی ہے۔ اس لئے کہ سیاست و معیشت کی سطح پر جو لہریں چلتی ہیں وہ آدمی کی ذہنی تہوں سے اُبھر کر ہی آتی ہیں۔ اس طرح اصل معاملہ ضمیر و کردار اور اخلاق کا ہو جاتا ہے۔ ع۔ از کوزہ ہماں تراود کہ در وست۔ ایسے میں نفرت کی جڑوں کو اُکھاڑ کر محبت کا پیغام دینا ادیب کا فرض منصبی ہو جاتا ہے، جس کو اگر وہ نہیں ادا کرے تو اس کے ادیب ہونے کے کوئی معنی نہیں رہ جاتے۔

افسوس ہے کہ ہندوستان و پاکستان میں اب بھی فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت معلوم عوام ہے کہ فسادات کی یہ ابتدا خالص سیاسی پس منظر میں ہوئی۔ لیکن اس اہم تر حقیقت سے پردہ اُٹھانے کی ضرورت ہے کہ اس سیاسی پس منظر میں بنیادی عامل وہ مغربی ذہن تھا جس کے اربع عناصر خود غرضی، مفاد پرستی، موقع شناسی اور ہنگامی ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے ملتے جلتے عناصر اس فساد انگیز فلسفۂ زندگی کے نتائج ہیں جو ڈارون کی حیوانیت، فرائیڈ کی ہوس پرستی اور مارکس کی شکم پروری سے مرکب ہے۔ اہل مغرب اسی فلسفے سے سرشار ہو کر اُٹھے اور چند تاریخی اسباب کے تحت پوری دنیا پر چھا گئے۔ چنانچہ انسانوں کی موجودہ نسل کی اکثریت، خواہ وہ امریکہ میں ہو یورپ میں ہو یا ایشیا و افریقہ میں، ذہنی لحاظ سے اسی فلسفے کی حلقہ بگوش ہے۔

اس فلسفے نے آدمی کو اس کی زندگی کے متعلق دو سبق سکھائے ہیں۔ ایک یہ کہ کائنات و حیات کی ابتدا اور انتہا دونوں صرف مادہ ہے، آدمی مادّے سے اُبھرا ہے اور مادّے ہی میں مٹ کر مل جائے گا۔ لہٰذا زندگی، خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ دنیا کی اسی محدود زندگی میں زیادہ سے زیادہ اور جلد سے جلد ہر قسم کی مادی آسائشیں حاصل کر لی جائیں۔ دوسرا سبق یہ کہ دنیا میں ہر مخلوق اور ہر قسم کی ترقی کا مدار خالص جسمانی کشمکش اور پیکار پر ہے، رزم گاہ حیات میں افراد اور طبقات کے درمیان مسلسل اور بے پناہ چپقلش برپا ہے، قوت بازو کا امتحان ہے جو اپنے آپ کو دوسروں سے زیادہ طاقتور ثابت کریگا بلکہ کمزوروں کو فنا کردے گا وہی زندہ اور سربلند رہے گا۔

مادیت، نفسانیت اور جاہلیت کا یہی فلسفۂ حیات جب ہمارے قومی دور میں داخل ہوا اور سیاسی سطح پر نمودار ہوا تو اس نے وقت کی غالب اور توانا قوموں کو "قوم پرستی" کا نعرہ دیا۔ اس نعرے کے پیچھے ایک پورا طرز فکر اور نظام عمل تھا بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ قوم پرستی عہد حاضر میں اقوام غالب کا "مذہب" بن گئی۔ اس نئے مذہب نے موجودہ مادی فلسفوں کے تمام وسائل کو سمیٹ کر ایک معین نظریۂ حیات میں مرتکز کر دیا۔ اس نے انسان اور انسان اور کائنات اور انسان کے رشتوں کے متعلق پچھلے تمام مذاہب کو ڈھا کر ایک بالکل نیا تصور دیا، نئے عقاید اور نئی اخلاقیات مرتب کیں۔ اب تمام غور و فکر اور حرکت و عمل کا محور و معیار "قومیت" ہو گئی۔ ہر اصول اور ہر اقدام کی صداقت کو جانچنے کی کسوٹی قوم کا مفاد بن گیا، جو بات اور کام قوم کے لئے مفید ہو وہ اچھا اور جو بات اور کام قوم کے لئے مضر ہو وہ برا۔ یعنی انسانی قدروں کے حسن و قبح کا فیصلہ بھی خالص سیاسی حکمت عملی کی بنا پر ہونے لگا۔ ان قدروں کی اصولی، اطلاقی و دوامی حیثیت ختم ہو گیا اور ان کی جگہ کاروباری نسبتوں اور وقتی افادیتوں نے لے لی۔

قوم پرستی کے اپنی مضمرات اور تقاضوں نے اپنی تنظیم، تکمیل و تشکیل کے لئے "جمہوریت" کے اس نظریے کو جنم دیا جس کی بنا پر اگر کوئی چیز زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے تو وہ اچھی ہے ورنہ بُری۔ اس قماش کی عاجلانہ "افادیت" نے اکثریت کو ہر جگہ اور ہر معاملے میں حاکم و مالک بنا دیا۔ چیزوں کی ذاتی و واقعی اور آفاقی و آخری اچھائی اور بُرائی سے قطع نظر کر لیا گیا۔ صرف ان کی عارضی و اضافی قیمت کو مد نظر رکھا گیا۔

ہندوستان میں فسادات کا تجزیہ کیا جائے تو ثابت ہو گا کہ ان کے حقیقی محرکات مذکورۂ بالا ذہنی عوامل ہی تھے۔ یہ صحیح ہے کہ یورپی مورخوں کی مغالطہ انگیز تاریخی تعبیروں، بالخصوص ہندوستان کی تواریخ کا "استحصال" اور برطانوی حکمرانوں کی فتنہ پرور سیاسی عیاریوں نے اس ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ پرستی کو ایک نظریے کے طور پر راسخ کر دیا۔ مگر ایسا صرف دو وجہوں سے ہو سکا۔ اول یہ کہ مغرب نے اپنے فلسفوں سے ہمارے ذہن کو مخبوط اور ہماری روح کو مسموم کر دیا۔ دوم یہ کہ ان فلسفوں نے ہماری پہلے سے گرتی ہوئی اخلاقی حالت کو فیصلہ کن طریقے پر بگاڑ دیا اور ہمارے اجتماعی کردار میں فساد کے حملوں کو روکنے کی صلاحیت نہیں رہ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وطن دوستی کی نعمت بہت جلد فرقہ پرستی کی لعنت میں تبدیل ہو گئی۔ برطانیہ کے سیاسی تسلط سے آزادی کی جنگ انہی ہتھیاروں سے لڑی جانے لگی جو دراصل انگریز نے ہماری دائمی غلامی کے لئے ڈھالے تھے۔ یہ ویسا ہی ہوا جیسے کوئی قیدی ہتھکڑیوں اور زنجیروں ہی سے دیوار زنداں کو توڑنے کی کوشش کرے۔ اس غیر متوقع انقلاب حال میں برطانیہ کے لئے تو صرف مسرت ہوگی

ہمارے لئے اس سے زیادہ خطرے کا سامان تھا اور وہ پیش آکر رہا۔ قوم پرستی اور اس کے اجزائے ترکیبی نے جہاں برطانیہ کی ہیئتِ اقتدار کے پرخچے اڑا دیئے وہاں ہندو مسلم صدیوں کے بھائی چارے کو بھی ریزہ ریزہ کر دیا۔ ہندو ایک فرقہ ہو گئے۔ مسلمان ایک دوسرا فرقہ بن گئے، دونوں نے اپنے اپنے فرقے ہی کو قدیم وحشی قبائل کی طرح پوجنا شروع کر دیا، اور اس فرقے کے مزعوم مفاد کے لئے ایک دوسرے کی گردن کاٹنے لگے۔

اس طرح ہم نے دیکھا کہ ہندو ہو یا مسلمان یا کوئی اور فرقہ ہندوستان میں واقع ہونے والے انسانیت سوز فسادات کے ذمے دار دونوں ہیں۔ اس برصغیر کے سبھی باشندے ہیں، وہ بھی جنھوں نے چھرے چلائے اور وہ بھی جو چھرے چلانے والوں کا ہاتھ نہیں پکڑ سکے، اور وہ بھی جن پر چھرے چلائے گئے اور انکی اخلاقی طاقت ظالموں کے ہاتھ میں لرزہ تک نہ پیدا کر سکی۔ جب کوئی وبا عام ہو جائے تو سمجھنا ہی پڑتا ہے کہ پوری بستی کی آب و ہوا خراب ہو گئی ہے۔ جن فسادات پر ہم گفتگو کر رہے ہیں وہ کوئی انفرادی حادثات نہیں، اجتماعی تہلکے ہیں۔ قوموں کی صدیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ بتاتی ہے کہ جب فساد اس حد تک ہمہ گیر ہو جائے تو پیوند کاری اصلاح کی بجائے مزید بگاڑ پیدا کرتی ہے۔ اس وقت ہم لوگ پوری دنیا کی طرح اپنے ملک میں بھی تاریخ کے ایک ایسے ہی نازک لمحے سے دوچار ہیں۔ ہر قسم کے نفسیاتی تاملات، ذہنی تحفظات اور سیاسی مشکلات سے بالا ہو کر ہمیں خالص اصولی نہج پر سوچنا چاہئے اور اصلاح احوال کے لئے بنیادی و کلی تدبیریں عمل میں لانی چاہئیں۔

حالات کے اس مختصر جائزے سے بھی ہم بہ آسانی اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ سارے فساد کی جڑ عصر حاضر کے انسان کا وہ مادہ پرستانہ نقطۂ نظر ہے جس کی بنا پر وہ اپنے معاشی خواہش کے لئے اپنے ہم جنسوں سے بیجا کش مکش ضروری سمجھتا ہے اور یہی کش مکش اجتماعی دائرے میں قدرتی طور سے پھیل کر سیاسی مفاد کی شکل اختیار کر لیتی ہے، پھر یہ معاشی و سیاسی مفاد ہی تکمیل و تحفظ کے لئے طبقے اور فرقے بناتا ہے اور اس طرح اپنے ذلیل مقصد کے لئے عزتوں اور عقیدوں کو بھی استعمال کرتا ہے۔ معاشی مفاد اور اس پر مبنی سیاسی کش مکش کے اس ناپاک چکر سے نکلنے کا راستہ کیا ہے؟

یہی وہ بڑا سوال ہے جس کو موجودہ فسادات نے ادیبوں کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ وقت اور مقام کی سیاسی ابتری کے پیش نظر انسانیت یہ سوال لے کر صرف ادیبوں ہی کے در پہ دستک دے بھی سکتی ہے۔ اس لئے کہ اب اہل سیاست کا کام نفرت پھیلانا ہو گیا ہے۔ اور ضرورت پیغام محبت کی ہے اس کے علاوہ ابتداً اور اصلاً معاملہ ذہنی درستی کا ہے، اور ظاہر ہے کہ عصر حاضر میں یہ کام مؤثر طریقے پر ادبی ذرائع سے ہی انجام دیا جا سکتا ہے۔ فساد کی نوعیت جس قسم کے علاج کا تقاضا کرتی ہے اس کی جانب اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اب ایک خصوصیت خود ادب کی بھی ہے۔ ادب اور بعض دوسرے علوم و فنون مثلاً سائنس اور صحافت میں فرق یہی ہے کہ اوروں کے بخلاف ادب خالص انسانی بنیادی و دوامی قدروں سے بحث کرتا ہے۔ ادب کو اعداد و مقادیر سے کوئی مطلب نہیں، یہ صرف اقدار و اوصاف کو بروئے کار لاتا ہے۔ یہ اقدار و اوصاف آخری تجزیے میں خالص اخلاقیات ہیں۔

انسانیت کے اخلاقی نقطۂ نظر سے جب ہم حالات پر نگاہ ڈالتے ہیں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ فساد کی اصل ذمے داری اس تخیل پر ہے کہ آدمی حقیقت میں ایک وحشی ہے جس نے ظاہراً اپنے آپ کو چند قواعد و قوانین کا پابند بنا لیا ہے مگر باطناً ہمیشہ اپنی خواہشات کے حصول میں لگا رہتا ہے، چنانچہ ایک سرد جنگ آدمیوں کے درمیان باہمی تعلقات کے پردے میں برابر جاری رہتی ہے، نتیجۃً جیسے ہی موقع ملتا ہے یہ سرد جنگ کشت و خون میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مغربی فلسفوں نے اجتماعیت کا جو سیاسی و معاشی تصور پیش کیا ہے اس کا بھیانک انجام ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ لہٰذا ادیب کے لئے اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ زندگی اور سماج کے اخلاقی نقطۂ نظر کو اختیار کر کے نئے سرے سے حالات کا جائزہ لے، انسانیت کا تعمیری تصور پیش کرے اور صالح قدروں کو رواج دے۔ اس مقصد کے لئے اولین کام یہ بتا دینا ہے کہ آدمی دراصل آدمؑ کی اولاد ہے اور اسی نسبت سے شریف ترین مخلوق ہے، وہ فرشتوں سے بھی زیادہ نیک ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اس کی سرشت میں خالق خیر کی روح پھونکی ہوئی ہے، وہ ایک حق آگاہ مظہر الوہیت ہے۔ اُسے زمین و آسمان کی ساری مخلوقات پر قابو عطا کیا گیا ہے۔ چنانچہ اپنی اسی فطرت اور فضیلت کی بدولت انسان کو پوری کائنات کے اہتمام کا ذمے دار قرار دیا گیا ہے، اس کی زندگی کا مقصد ہی یہ جانچ ہے کہ وہ کہاں تک اپنے اعمال و افعال سے اپنے اوپر کئے گئے اعتماد کو صحیح ثابت کرتا ہے وہ اپنی ایک ایک حرکت کے اچھے اور بُرے کے لئے جوابدہ ہے، روز انجام اس کی سرخروئی یا روسیاہی دولت، رتبے اور نسل پر منحصر نہیں، صرف عمل کے نیک و بد پر منحصر ہے۔ اس نیک و بد کی تمیز و تعمیل کے لئے انسان پر چند ناقابل شکست و تغیر ضابطے مقرر کر دیئے گئے ہیں جن سے سرمو انحراف کسی شخص کے لئے کسی لمحے جائز نہیں۔

اسی اخلاقی نقطۂ نظر کا دوسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر ملت، نسل، رنگ اور مقام کے انسان ایک باپ اور ماں کی اولاد ہیں اور اس طرح پیدائشی طور پر ایک دوسرے کے بھائی اور بہن ہیں، لہٰذا ان کے درمیان اصلی رشتہ فریق اور فریق کا نہیں بلکہ رفیق اور رفیق کا ہے۔ ع:

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند

(باقی)

جے کرشن چودھری جبل پور

سنسکرت شاعری کے ترجمے کے مسائل

(آل انڈیا ریڈیو بھوپال کے شکریے کے ساتھ)

ایک زبان کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنا ایک فن ہے۔ اور ایک نہایت ہی مشکل فن۔ یوروپ میں اعلیٰ درجے کے ترجمہ کرنے والوں کا مقام بلند پایہ لکھنے والوں کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ وہاں اس بات کا احساس ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں اچھی اچھی کتابوں کا ترجمہ کرنا بہت ضروری ہے۔ اس سے علم کا خزانہ بڑھتا ہے۔ زبان نئے نئے الفاظ کے آنے سے اور نکھر جاتی ہے۔ جغرافیائی حدیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ راہ و رسم کے راستے ہموار ہو جاتے ہیں۔ مختلف زبانوں کے بولنے والے لوگ ایک دوسرے کے زیادہ قریب آ جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے جذبات کی قدر کرنا سیکھتے ہیں، جس سے انسان دوستی بڑھتی ہے۔ اس کے علاوہ نئے نئے خیالات سے انسان کے دل اور دماغ میں ترقی کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں۔

لیکن کامیاب ترجمہ کرنے کے لئے ہمیں کئی کٹھنائیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہر زبان کی ایک اپنی دنیا ہوتی ہے وہ خاص حالات میں پیدا ہوتی ہے اور پروان چڑھتی ہے اس کی ایک خاص فضا، کلچر، روایات اور دیومالا ہوتی ہے ہر ایک زبان کا ایک خاص لب و لہجہ اور مزاج ہوتا ہے اور بیان کے الگ الگ طور طریقے ہوتے ہیں۔ ترجمے میں ان چیزوں کو اس انداز سے لانا کہ ترجمے پر اصل کا دھوکا ہو بہت ہی کٹھن ہے اور یہ کٹھنائی کئی درجہ اور بڑھ جاتی ہے۔ جب ایک زبان کی شاعری کو دوسری زبان میں لایا جائے۔ شاعری سیکھی جا سکتی ہے۔ سکھائی نہیں جا سکتی۔ جہاں نثر صرف سمجھنے کی چیز ہے نظم سمجھنے کے علاوہ محسوس کرنے کی بھی چیز ہے۔ اس واسطے نظم کے ترجمہ کرنے میں قدم قدم پر یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں اصل کا سارا لطف ہی کرکرا نہ ہو جائے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ ایک زبان کی شاعری کا ترجمہ دوسری زبان میں کرنے کے لئے شاعر کی طرح حساس تیز اور نازک دل ہونا چاہئے۔ امریکہ کے مشہور نقاد ہمفریز نے کہا ہے کہ ناول لکھنے والا کہانی کار ہی ناول اور کہانی کا ترجمہ کرے، ڈرامہ کا ترجمہ ایک ناٹک کار ہی درست طور پر کر سکتا ہے اور جو شخص خود شاعر نہیں اسے شاعری کا ترجمہ نہیں کرنا چاہیے۔

مجھے سنسکرت کے دو شاعروں کالی داس اور بھرتری ہری کے کلام کو جب اردو میں پیش کرنے کی خواہش پیدا ہوئی اور میں نے کام شروع کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں کئی مشکلوں میں گھر گیا ہوں۔ ایک ایک پد یا شلوک کو اردو میں لانے کے لئے غور و فکر میں کئی گھنٹوں اور کئی مرتبہ کئی کئی دن لگانے پڑے ہے شکر ہے کہ میرے ارادے اور حوصلے میں کمی نہیں آئی اور میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی گیا۔

ترجمہ کرنے والے کا دونوں زبانوں میں ماہر ہونا ضروری ہے۔ اسے دونوں زبانوں کے علم و ادب، کلچر، روایات اور دیومالا وغیرہ سے مکمل واقفیت ہونی چاہئے۔ سنسکرت زبان اپنے خاص انداز بیان، گہرائی اور دیومالا کے لئے دنیا میں مشہور ہے۔ اس کے ادب میں تمام دھارمک گرنتھوں، وید، شاستر اور پرانوں کی کتھاؤں کے حوالے کثرت سے ملتے ہیں۔ اس پس منظر کو سمجھے بغیر ترجمے کی کوشش کرنا بے معنی ہے۔ اگر ترجمہ کرنے والا اس کسوٹی پر پورا نہیں اترتا تو ترجمہ اصل سے کوسوں دور ہوگا اور اس میں وہ خوبی اور خوبصورتی اور نزاکت نہ ہوگی جو سنسکرت شاعری کی جان ہے اور جو چھوٹے چھوٹے لطیف اشاروں میں چھپی ہوئی ہے۔ ترجمہ کرنے والے کو سنسکرت ادب کی گہرائیوں میں ڈوب کر ہی وہ موتی ملیں گے جو شاعر نے اپنی طبیعت کی جولانی میں کاغذ کے صفحوں پر بکھیر دئے ہیں۔ اور جیسے وہ دوسری زبان بولنے والوں کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے دوسری زبان والے بھی تب ہی انھیں دیکھنے کی تکلیف گوارا کریں گے اگر آپ کے پیش کرنے کا انداز شستہ، شگفتہ اور دلچسپ ہے۔ ورنہ آپ لاکھ موتی رولتے رہیں کوئی ان کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا۔ کامیاب ترجمہ وہ ہے جس میں اصل کی روح لطافت گم نہ ہو جائے اور اپنی زبان کی مٹھاس اور لطف بیان بھی قائم رہے۔ وہی جذبہ، وہی تڑپ، وہی گرمی اور وہی اثر جو اصل شعر میں ہے۔ ترجمے میں آنا چاہئے۔ بے جان غلط اور پھسپھسا ترجمہ نہ صرف ناکام ہے بلکہ دونوں زبانوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔

دونوں زبانوں کی واقفیت کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ترجمہ کرنے والے کے دل میں دونوں زبانوں کے لئے ایک جیسی عزت اور پیار کا جذبہ ہو۔ کسی ایک کو گھٹیا یا بڑھیا سمجھنے سے ہم ان زبانوں کے بولنے والوں کو بجائے قریب لانے کے اور دور کر دیں گے۔

سنسکرت شاعری کے ترجمے کے سلسلے میں ایک اہم مسئلہ معقول ڈکشنری یا شبدکوش کا نہ ہونا ہے۔ کہنے کے لئے کئی شبدکوش موجود ہیں جن سے اسکول یا کالج کے بچوں کا کام چل جائے تو چل جائے لیکن ایک ادیب کے لئے وہ ناکافی ہیں اور ہماری رہنمائی نہیں کر سکتے۔

ایک اور مسئلہ جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ ترجمہ لفظی ہو یا آزاد۔ سنسکرت کے کئی دھارمک گرنتھوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ مثلاً رامائن، مہابھارت، گیتا اور شریمد بھاگوت۔

اس سلسلے میں شیوبرت لال ایم۔ اے اور کئی دوسرے ادیبوں کے ترجمے کافی مقبول ہوئے۔ لیکن چونکہ وہ زیادہ تر لفظی ترجمے کے چکر میں پھنسے رہے اس لئے دوسری زبان کے سیکھنے والوں کے لئے اور خصوصاً دوسری تہذیب میں پلے ہوئے لوگوں کے لئے جگہ جگہ ایک پہیلی بن گئے۔ اشاروں اور ارتھوں کی بھرمار سے پڑھنے والوں کی دلچسپی ختم کر دی گئی۔ کبھی وہ اپنے آپ کو ایک ماحول تو کبھی دوسرے ماحول میں سانس لیتے ہوئے پاتے ہیں۔ شکنتلا ڈرامہ کی ایک مثال لیجئے۔ شکنتلا بے ہوش ہو گئی ہے۔ اس کی سہیلیاں اُسے ہوش میں لانے کی تدبیر کر رہی ہیں۔ ایک ترجمہ کرنے والے نے لکھا ہے کہ سہیلیاں۔

پتہ پُرین کا انھیں ہلاتی

یہاں جب تک پڑھنے والے کو پُرین کا پتہ معلوم نہ ہو، اس کا لطف نہ آئے گا کیونکہ وہ تو آنچل کی ہوا کا عادی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایسے ترجموں سے نہ روانی پیدا ہو سکتی ہے اور نہ سمجھنے میں آسانی یا لطف حاصل ہو سکتا ہے۔

مغل شاہنشاہوں اور خاص کر اکبر کی سرپرستی میں کئی سنسکرت گرنتھ گیتا اور نل دمینتی وغیرہ فیضی اور دوسرے عالموں نے ترجمے کئے۔ ان کو ترجمہ کی زبان میں ڈھال کر پورا ماحول بدل دیا گیا ہے۔ ماحول کے بدلنے سے ساری کیفیت بدل جاتی ہے۔ ہندوستانی معاشرت کو ایرانی ماحول یا کسی اجنبی ماحول میں پیش کرنے سے دورنگی ظاہر ہونے لگتی ہے جو کسی صورت میں مناسب نہیں۔ فراق گورکھپوری نے کہا ہے کہ سنسکرت کو کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرتے وقت ہندوستانی مٹی کی خوشبو کا ہونا ضروری ہے۔ یہاں کی ہواؤں کی لچک، یہاں کا آکاش، سورج اور ستاروں کا عکس ترجمے میں نظر آنا چاہئے۔

موجودہ دور میں کئی ادیبوں نے سنسکرت شاعری کا نثر یا نظم میں ترجمہ کیا ہے۔ ان میں کئی تو ایسے ہیں جو براہ راست سنسکرت سے ترجمہ کرنے کی بجائے اُس کے انگریزی یا ہندی ترجمہ سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔ ان میں اصل کا لطف اور ماحول ڈھونڈنا غلط بات ہے۔

ایک اور مسئلہ جو سنسکرت شاعری کے ترجمہ کے سلسلے میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شاعر نے ایک مطلب یا جذبہ کے ظاہر کرنے کے لئے نازک اور دوسرے جذبے کے اظہار کے لئے تیز و تند یا بھاری بھرکم لفظ استعمال کئے۔ ان کو دوسری زبان میں لانا بہت کٹھن ہے اور وہ لطف جو اصل کے پڑھنے والے کو ملتا ہے وہ ترجمے میں برباد ہو جاتا ہے۔ مثلاً نوح کا شعر ہے:۔

وہ صورت نظر اب نہ آئے گی مجھ کو یہ صورت مجھے اب نظر آ رہی ہے

یہاں صورت کے معنی میں جو لطف ہے وہ ترجمہ میں غارت ہو جاتا ہے۔ سنسکرت میں النکاروں کی بھرمار ہے۔ خاص کر کالی داس اپنی اُپماؤں یا تشبیہوں کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔ ان النکاروں اور اُپماؤں کا مناسب ترجمہ کرنا لوہے کے چنے چبانا ہے۔

میری نظر میں سنسکرت شاعری کا کامیاب ترجمہ وہ ہے جو اصل سے faithful ہوتے ہوئے ہر لفظ کا ترجمہ کرنے کے بجائے مصنف یا لیکھک کا ترجمہ کرے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اُس کے خیالات اور جذبات کی صحیح ترجمانی ہو سکے اور ترجمہ میں مصنف کی روح یا اسپرٹ قریب قریب ویسے ہی پائی جائے، جیسے کہ اصل میں ہے۔ ترجمہ کرنے والے کو آزادی ہونی چاہئے کہ وہ اصل کی لطافت کو کھوئے بغیر اپنے حُسنِ بیان سے اصل کی فضا پیدا کرے۔ یہ ایک بہت بڑا آدرش ہے جو بڑی محنت، مطالعہ اور حوصلے سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

کانپور کے مجاہدینِ آزادی

کان پور کے جنگ آزادی کے مجاہدین کے سوانح حیات مرتب کرنے والی کمیٹی نے اب تک ۱۸۷۲ مجاہدین کے سوانح مرتب کر لئے ہیں۔ ان مجاہدین میں ۵۰ عورتیں بھی شامل ہیں۔

یہ بات خاص دلچسپی کی ہے کہ جنگ آزادی میں حصہ لینے والی عورتوں کی زیادہ تعداد مواضعات و قصبات کی رہنے والی ہے، شہر کی عورتوں کی تعداد کم ہے۔

یہ سوانح سرکاری طور پر شائع ہونے والی کتاب میں شامل کئے جائیں گے۔ (نیشنل ہیرالڈ)

میر تقی میر کی کلیات

لکھنؤ کی میر اکیڈمی کے چیرمین مسٹر مقبول احمد لاری نے انکشاف کیا ہے کہ میر تقی میر کی کلیات کے ترجمے غیر ملکی اور ہندوستانی زبانوں میں کئے جائیں گے۔ اس مقصد کے لئے مختلف زبانوں کے ماہرین کی خدمات حاصل کی جائیں گی۔ میر کی اکثر نظمیں، انگریزی، پنجابی، فارسی، عربی، ہندی اور دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔

اکیڈمی میر کی کتابوں کو عام کرنے اور لکھنؤ میں اُن کی یادگار قائم کرنے کا بھی ارادہ رکھتی ہے۔

ضروری اعلان

براہ مہربانی خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے

مالک انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ، پبلشر نذیر حسن، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا۔